© rasailojaraid.com

ڈاکٹر مصطفیٰ احمد زرقا
پروفیسر قانون سوریا یونیورسٹی دمشق

اِسلامی فقہ کے مآخذ

تیسری قسط

عرف کی شان:

وہ اقوام جو اجتماعی زندگی میں کوئی شریعت نہیں رکھتیں، ان کے لیے عرف و عادات ہی وہ شریعت ہے جس پر بھروسہ کیا جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ عرف کو انسان کی مدنی زندگی میں قدیم ترین دور سے ہی قوت حاکمہ ہونے کی حیثیت حاصل رہی ہے۔

پھر ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ بعض عرف تو بذات خود حسن اور منصفانہ ہوتا ہے اور بعض اپنی ذات کے اعتبار سے قبیح اور نامنصفانہ۔ اسی بناء پر سارے ہی شرائع کا یہ مرکزی نقطہ نظر رہا ہے کہ عرف حسن کو تو فروغ دیا جائے اور عرف قبیح کو ممنوع ٹھہرایا جائے۔

آج کل کے وہ قوانین جو اپنی ذات میں دینی و مذہبی نہیں، بلکہ خالص وضعی ہیں ان کے مآخذ میں سے ایک اہم مصدرِ قانون یہ عرف و عادت ہے، اور واضعان قانون اکثر احکام متعارفہ میں عرف سے استمداد کرتے ہیں، اور بعض حالات میں، جہاں عرف سے ابہام و خفا کی وضاحت نہیں ہوتی، وہاں قانونی دفعات کی صورت میں اس کا اظہار کرتے ہیں۔

اور پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اسلامی شریعت آتی ہے، تو وہ بھی اکثر ان رواجوں اور حقوق کا اعتبار کرتی ہے جو عرب میں اسلام سے بیشتر متعارف تھے اور بہت سے مراسم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

و عادات کو مہذب بناتی ہے اور بہتوں کو ممنوع ٹھہراتی ہے۔ جیسا کہ وہ لوگوں کی حاجت و مصلحت کے پورا کرنے کی خاطر ایسے احکام [illegible] ہے جن سے اجتماعی زندگی میں حقوق و واجبات کی تنظیم کا احاطہ ہوتا ہے، اس لیے کہ [illegible]ائع الٰہیہ اپنے معاشرتی احکام کے ذریعہ یہ چاہتی ہیں کہ انسان کی مصالحت و حقوق کی بہترین طور سے تنظیم ہو، لہٰذا وہ لوگوں کے انہی رواجوں اور عرف و عادات کا لحاظ و اعتبار کرتی ہے جن کو وہ اپنی غرض و غایت کی تکمیل کے لیے مفید سمجھتی ہے اور جو اس کے اساسات اور اس کے اسلوبوں سے مناسبت رکھتے ہیں۔

عرف کے اعتبار پر دلیل شرعی:

بعض علماء نے اثبات احکام کے باب میں مذکورہ اصطلاحی معنی والے عرف کے اسلام میں معتبر ہونے کے مقام مرتبہ کی دلیل شرعی کے طور پر متذکرہ بالا آیت قرآنی کا تذکرہ کیا ہے[1]

لیکن ظاہر ہے کہ اس آیت میں عرف اپنے لغوی معنی میں مستعمل ہوا ہے، یعنی وہ امر مستحسن جو پسندیدہ ہو، نہ کہ فقہی اصطلاح کی رو سے جو عرف کا معنی ہے، وہ اس آیت میں مراد ہے۔

مگر استدلال یوں قائم ہوتا ہے کہ اس آیت میں اگرچہ اصطلاحی معنی والا عرف مراد نہیں ہے، مگر مصطلحہ عرف کے اسلام میں معتبر ہونے کے لزوم پر دلالت کرنے سے آیت خالی بھی نہیں ہے، کیونکہ اعمال و معاملات میں لوگوں کا عرف وہی قابل اعتبار ہوتا ہے جو ان کے نزدیک مستحسن ہو اور جو ان کی عقلوں کے نزدیک مالوف ہو۔

یہ تو بعض علماء تھے، لیکن بقیہ علماء احکام شرعیہ کی بنا میں فقہی عرف کے مقام و مرتبہ پر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے ایک اثر موقوف[2] سے استدلال

---

[1] یعنی خذ العفو وامر بالعرف واعرض عن الجاھلین۔ [2] اثر موقوف وہ روایت ہے جو کسی صحابی پر ختم ہو جائے، یعنی وہ صحابی اس روایت کا استناد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نہ کرے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ :۔ مارآہ المسلمون حسناً فھو عند اللہ حسن۔
"جس کو مسلم معاشرہ مستحسن تصور کرے وہ عنداللہ مستحسن ہے"

فقہ اسلامی میں عرف کا اقتدار:

اسلامی فقہ میں بکثرت بنائے احکام میں عرف کا شرعی حیثیت سے اعتبار کیا جاتا ہے اور اس کے اس طرح شرعی کیے جانے پر سارے فقہی اجتہادات متفق ہیں، اگرچہ اس کے حدود میں اختلافات ہیں، اور فقہاء نے خصوصاً حنفی المسلک فقہاء نے مختلف معاملات اور تصرفات وعمل کی مختلف نوعیتوں میں لوگوں کے حقوق کے ثبوت وعدم ثبوت میں عرف کو بڑا وزن دیا ہے۔ اور انہوں نے عرف وعادت کو ایک مہتم بالشان اصل اور ایک عظیم ووسیع مصدر قانون کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے، جس کے مقتضیٰ کی رو سے لوگوں کے درمیان احکام حقوق ثابت کیے ہیں، جہاں پر کہ کوئی خاص نص شرعی اس سے متصادم نہ ہوتی ہو جو عرف کی کارفرمائی کو روک رہی ہو۔

پس فقہاء کی نظر میں عرف ایک دلیل شرعی ہے اور جہاں پر کہ اس عرف کے علاوہ اور کوئی دلیل نہ ہو، وہاں لوگوں کے حقوق وفرائض کے احکام کے ثبوت کے لیے اس عرف کا وجود بذات خود کافی ہے، بلکہ جب عرف سے قیاس کا تعارض ہوتا ہے تو قیاس کو اپنے قدم پیچھے ہٹا لینے پڑتے ہیں، کیونکہ وہ قیاس حرج واختلال کا موجب بن جائے گا۔ جو اپنے نتیجہ واثر کے لحاظ سے اس عرف کے خلاف ہے جو لوگوں کے درمیان جاری وساری ہے، لہٰذا ایسے موقع پر قیاسی حکم ترک کرکے مقتضائے عرف کے مطابق عمل کیا جاتا۔ استحسان کی قبیل سے ہوگا جو قیاس پر مقدم رکھا جاتا ہے۔

البتہ جب عرف کسی ایسی نص شرعی سے معارض ہو، جو امر متعارف کے خلاف حکم دے رہی ہو۔ تو پھر عرف کا اعتبار ہوگا یا نہیں؟ اگر ہوگا تو تو اس اعتبار کا محل اور درجہ کیا ہے؟ یہ ایک تفصیلی بحث ہے، جس کا یہ مقام متحمل نہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چند اھم فقہی قواعد:

اب ہم چند ایسے قواعد کلیہ کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں، جو عرف پر قائم شدہ اکثر فروعی احکام کے لیے اساس وضوابط کا کام دیتے ہیں۔ اور جن کو فقہائے عرف وعادات کے معاملہ میں مقرر کیا ہے۔ اور جن کی ایک تعداد کو ہمارے مجموعۂ قوانین کی دفعات میں ذکر بھی کیا گیا ہے۔

(الف) عادت تحکیمی شان رکھتی ہے۔ (دفعہ ۳۶)

(ب) عادت کی دلالت سے حقیقت متروک ہو جاتی ہے۔ (دفعہ ۴۰)

(ج) لوگوں کا تعامل ایک حجت ہے، جس پر عمل ضروری ہے۔ (دفعہ ۳۷)

(د) معروف عرف سے اسی طرح وابستہ ہے جس طرح مشروط شرط کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ (دفعہ ۴۳)

(ہ) عرف سے کسی حکم کی تعیین نص کے ذریعہ تعیین کے مثل ہے (دفعہ ۴۵)

(و) زمانہ کے تغیر سے احکام کے تغیر پذیر ہو جانے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ (دفعہ ۳۹)

اور ان قواعد کی اساس پر فقہاء نے مختلف فقہی ابواب و معاملات میں بے شمار احکام متفرع کیے ہیں۔ مثلاً

۱۔ نکاح کے وقت جب مہر کا تذکرہ نہ ہو عرف کی طرف اسے راجع کر دیتے ہیں کہ وہ معجل ہو گا یا مؤجل، جو بھی ہو، اس کی مقدار کیا ہوگی، اور عرف کے مطابق اس معاملہ میں حکم دیا جائے گا۔

۲۔ بیع و شراء کے معاملہ میں کونسا عیب فسخ کا موجب ہوتا ہے اور کون سا نہیں، بلکہ کس کو عیب کہیں گے اور کس کو نہیں، یہ سب عرف ہی کی بنا پر متعین ہوتا ہے۔

۳۔ امانت دار کے ہاتھ سے مال امانت ضائع ہو جاتا ہے، کیا اس نے اس کی حفاظت میں کوتاہی کی حتی کہ اس سے تاوان وصول کیا جائے۔ یا اس کی جانب سے لاپرواہی و کوتاہی سرزد نہیں ہوئی۔ حتی کہ اسے تاوان سے بری کیا جائے۔ اس کے تولنے کی میزان عرف ہی ہے۔ یہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

الوعی حیدر آباد

اور اسی قسم کے دیگر بے نہایت قضایا ہیں جن سے فقہ کی فصول بھری ہوئی ہیں اور جن کے متعلق احکام کے لیے عرف اور صرف عرف فیصلہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

لیکن یہاں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ وہ احکام جن کی بنا عرف ہوتا ہے، عرف کے تبدیل ہو جانے پر ان میں بھی تبدیلی آجانی ناگزیر ہے۔ اسی لیے متذکرہ بالا فقہی قواعد کلیہ میں سے ایک قاعدہ یہ تھا کہ ——— "زمانہ کے تغیر سے احکام کے تغیر پذیر ہو جانے سے انکار نہیں کیا جا سکتا"

خاتمۂ کلام!

یہ تھے فقہ کے اساسی و ذیلی مآخذ و مصادر، پس ہر اس فقہی حکم کے لیے جسے چاہے جس مسلک کے فقہاء مدون کریں ضروری ہے کہ وہ ان مآخذیں سے کسی پر مستند ہو۔

لیکن کچھ علماء سارے مآخذ فقہ کو صرف کتاب وسنت میں دائر رکھتے ہیں، اس لیے کہ اجماع کے لیے ضروری ہے کہ وہ فی الواقع ان دونوں میں سے کسی پر مستند ہو، اور قیاس کا بھی مرجع کسی نص کی علت ہوتا ہے، جو مقیس علیہ (جس پر قیاس کیا جائے) میں ہوتی ہے، لہٰذا قیاس اس نص کی دلالتوں میں سے ایک دلالت ہوا۔

بلکہ بعض حضرات تو سارے مآخذ کو صرف کتاب میں مرتکز کرتے ہیں، اس لیے کہ اسی نے سنت کو واجب القبول گردانا ہے اور سنت اس (قرآن) کے اصولوں اور بنیادوں سے باہر نہیں جاتی۔

یہ رائے بذات خود چاہے غلط نہ ہو، لیکن عملی حیثیت سے مفید کار نہیں، اس لیے کہ اثبات احکام کے باب میں ہر موقع پر اس کے لیے شخصی یا نوعی دلیل خاص کے استناد کے لیے نص قرآنی پیش کرنے سے یہ رائے قاصر ہے۔ ہاں اس دلیل کا منشا و اعتبار تو قرآن سے پیش کیا جا سکتا ہے، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تمام امور کا منشاء اعتبار قرآن ہی ہے۔ مگر کسی کے لیے منشاء اعتبار ہونے اور کسی کے لیے مدار و مبنیٰ اور مستند الیہ بننے میں بہت فرق ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پھر اس کے باوجود یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ مثلاً دادا اور دادی کے لیے وراثت میں چھٹا حصہ مقرر کیا جانا ازروئے نص قرآنی ہے، بلکہ میت کے باپ کی عدم موجودگی میں اس کے بیٹے کے ساتھ میراث میں دادا کا اصحاب فرائض میں سے قرار دیا جانا، اجماع کی رو سے ہے اور دادی کا فریضہ ازروئے سنت ثابت ہے، اس لیے کہ قرآن نے ان میں سے کسی کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔

پس ایسی صورت میں اس حکم (باپ کی عدم موجودگی دادا کے لیے سدس) کی دلیل خاص کے لیے کوئی ایسی مخصوص نص قرآنی نہیں جو اس کے واسطے مستند الیہ اور مصدر و مآخذ کا کام دے، البتہ اس کے معتبر ہونے کے لیے بطور منشاء کے قرآن کی وہ آیت ہے جس میں باپ کے لیے سدس کا حکم ہے۔ لیکن گفتگو منشاء احکام میں نہیں ہو رہی ہے، بلکہ مآخذ و مصدر احکام اور دلائل کے مستند الیہ کے بارے میں ہو رہی ہے۔

(ترجمہ: افتخار احمد مغنی)

© rasailojaraid.com